محمد اسلم چیمہ

اسلام میں ہبہ کا مسئلہ

یہ ایک بے حد اہم فقہی مسئلہ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس موضوع پر سلجھے ہوئے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ابھی تک موضوع تشنہ ہے ضرورت ہے کہ مزید وضاحت سے وہ اپنے خیالات قلمبند فرمائیں۔ دوسرے اصحاب علم کے افکار بھی ہم مسرت سے شائع کریں گے

ہبہ علی الاولاد کے سلسلہ میں تسویہ فی الہبہ ہی متوازن اور فطری اصول ہو سکتا ہے۔ ہبہ کی صورت میں اولاد کے درمیان ترجیحی سلوک برتنا اور کسی کو کم یا زیادہ دینا یا کسی کو بالکل محروم کرنا اسلامی اصولِ عدل کے منافی ہے۔ عدم تسویہ سے قطع رحمی اور عقوق پیدا ہوتے ہیں۔ قریبی اور رحمی رشتوں کے درمیان فساد کا بیج بو یا جاتا ہے۔ نہ صرف بھائی بھائی کا گلا کاٹتا ہے بلکہ درج ذیل قباحتیں بھی رونما ہوتی ہیں جو کہ انتہائی سنگین، قابل مواخذہ اور ناقابل برداشت ہیں:

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے صاحبِ جائیداد کو اس پر تصرف کے وسیع اختیارات دے رکھے ہیں، اور غیر اسلامی قوانین کے بالمقابل اسلامی قانون میں یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ اس اختیار کا مطلب تو یہ ہے کہ مالک جائیداد اپنی ذاتی اغراض کو اپنی جائیداد میں بیع یا رہن کے ذریعہ تصرفات سے پورا کر سکے اور ورثا اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ یا اگر وہ کسی غیر وارث کو بطور عطیہ کچھ دینا چاہے تو دے سکے ورثا اس کو مجبور

نہ کرسکیں۔ لیکن اختیار کے اصول کو اس بات پر چسپاں کرنا اور اسے اس قدر وسعت دینا کہ شریعت کے مقرر کردہ ورثا ہی میں افراط و تفریط کا سلسلہ چل پڑے اور قانونِ وراثت کا ڈھانچہ بدل کر رہ جائے یہ صورت نہ صرف اخلاق سوز ہے بلکہ قرآن کے حکم یوصیکم اللہ فی اولادکم کے بھی منافی ہے۔

آیت ہذا کا مطلب بالکل صاف ہے۔ جب کوئی صاحب جائیداد اپنی جائیداد اپنی اولاد کو اپنی زندگی میں دینا چاہے تو وہ للذکر مثل حظ الانثیین پر ہی عمل کرے گا۔ اور اگر وہ ترکہ چھوڑ کر مر جائے تو بھی قاعدہ للذکر مثل حظ الانثیین پر عمل کیا جائے گا۔ اس کو یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں کہ وہ اپنا شارع آپ اور خود قانون ساز بن جائے۔ بلکہ از روئے شریعت وہ قانونِ خداوندی کا پابند ہے۔ قانون الٰہی نے حقوق کی جو شرح ورثا کے لیے مقرر فرمائی ہے، اُس کی پابندی کرنا اس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شریعت کے مقرر کردہ دوسرے حدود و قیود کی۔ لہٰذا عدم تسویہ فی الہبہ سے پہلی خرابی تو یہ واقع ہوتی ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق جو اصولِ تقسیم اولاد کے لیے مقرر کرے گا وہ خدا کے مقرر کردہ اصولِ تقسیم کے مطابق نہ ہوگا۔ گویا خدا کے قانون کی موجودگی میں مسلمان کا اس کے بالمقابل اپنی خواہشات کے مطابق اصول وضع کرنا دراصل قرآنی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس سے بڑھ کر حدود اللہ کی خلاف ورزی اور کیا ہوسکتی ہے کہ آدمی جس قانون کا شرعاً پابند ہو اس میں اسے یہ اختیار مل جائے کہ وہ اسے اپنی صوابدید کے مطابق تشکیل کرسکے۔ یہ اتباعِ قانونِ شریعت نہیں ہے بلکہ شارعِ خواہشات خود بننا ہے۔

۲۔ وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت کی بھی یہی وجہ ہے۔ حالانکہ وہ صرف جائیداد کے تیسرے حصہ ہی کی جاسکتی ہے۔ بھلا ایک ذریعہ (وصیت) سے تو شریعت میں تیسرا حصہ جائیداد ورثا کو دینے کی ممانعت ہو۔ اور دوسرے ذریعہ (ہبہ) سے تمام جائیداد ورثا میں قانونِ شریعت کے علی الرغم بانٹ دینے کا حق حاصل ہو۔ یہ کیسا تضاد ہے؟ گویا شریعت نے

ایک راستہ ایک خرابی کا بند کر کے دوسرا اس سے بڑا راستہ اُس خرابی کے لیے کھول دیا۔ یعنی یہ خرابی ایک راستہ (وصیت) سے ناجائز ہے اور اگر یہی خرابی دوسرے راستہ (ہبہ) سے وقوع پذیر ہو تو جائز ہے نعوذ باللہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ ایک ہی کام ہے اور ایک ہی اسپرٹ۔ یعنی اولاد سے ترجیحی سلوک۔ اس کو وصیت سے پورا نہ کیا جا سکے لیکن ہبہ کے ذریعہ پورا کر لیا جائے۔ کیا یہ خرابی دونوں طرح سے یکساں پیدا نہیں ہوتی؟ اور جب حضور صلعم کی حدیث کے ذریعہ وصیت علی الاولاد پر قانونی پابندی لگائی جا سکتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ذریعہ ہبہ علی الاولاد کے عدم تسویہ پر قانونی پابندی عائد نہیں ہو سکتی؟

۳۔ مسلمان کا فرض اعلائے کلمۃ الحق ہے، اور اللہ کے دین کو تمام ادیانِ باطل پر غالب کرنا ہے۔ لیکن ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ کو ہمارے معاشرہ میں جب جواز کی راہ ملتی ہے تو قانونِ خداوندی سے بچنے کی خاطر یہ حیلہ ایک چور دروازے کا کام دیتا ہے، اور صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ رواج کا قانون خدا کے قانون پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ شریعت ایکٹ کے نفاذ کی وجہ سے لوگ اپنی زندگی ہی میں جائیداد بیٹوں کے نام اس لیے منتقل کر دیتے ہیں کہ بیٹیاں وراثت میں حصہ دار نہ بن جائیں۔ گویا شریعت ایکٹ کے نفاذ کے باوجود لوگوں کا عمل درآمد رواج ہی پر ہوتا ہے۔ یہ صورت کہ مسلمان کا مشن ہی فوت ہو جائے، اور وہ اسلامی قانون کے علاوہ کسی دوسرے قانون کی اطاعت و وفاداری میں لگ جائے۔ اسلام تو کیا دنیا کا کوئی بھی نظام برداشت نہیں کر سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت ایکٹ سے بچنے کے لیے حیلہ سازی کا یہ دروازہ کھولنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس ایکٹ ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا جائے اور انگریزی عہد حکومت کی طرح لوگوں کو آزادی دیدی جائے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی وراثت تقسیم کریں۔ حیلہ سازی کے ذریعہ لوگوں کو شرک میں ملوث کرنے سے تو کفر ہی بہتر ہے۔ قرآن غیر اللہ کے قانون کی اطاعت و وفاداری کو شرک قرار دیتا ہے۔

(۱) ولا یشرک فی حکمہ احداً (کہف) وہ (اللہ) اپنے حکم (قانون) میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

(ب) افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون (مائدہ)

کیا وہ جاہلیت کے حکم (قانون) پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یقین رکھنے والی قوم کے لیے اللہ سے کونسی ذات بہتر ہے جو حکم (قانون) دے۔

(ج) ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ہ (مائدہ)

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اپنا فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان کے لیے خدا کے قانون کی پابندی ایک لازمی چیز ہے، اور نہ صرف اس پابندی سے براہِ راست چھٹکارا نہیں بلکہ حیلہ سازی کے ذریعہ اس پابندی سے گریز کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ اس معاملہ میں حیلہ سازی بنی اسرائیل کے سبت کے واقعہ سے کم نہیں جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔

۴۔ جب ہبہ علی الاولاد کی صورت حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئی تو آپؐ نے نہ صرف ایسے ہبہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس کو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا بلکہ ایسی صورت کو ظلم اور بے انصافی بھی قرار دیا۔ حالانکہ وہاں مندرجہ بالا ضمن نمبر ۳ میں بیان کردہ خرابی کا احتمال نہیں تھا۔ وہاں ترجیحی سلوک سے مراد صرف بیوی کو راضی کرنا تھا۔ حضرت بشیر صحابیؓ کی اور بھی بیویاں تھیں، اور ان سے بھی اولاد تھی۔ لیکن عمرہ بنت رواح کا اصرار تھا کہ میرے بیٹے نعمان کو جب تک ایک قطعہ باغ بطور عطیہ نہیں دیا جاتا، میں اس کی تربیت نہیں کروں گی۔ یہ واقعہ حضرت نعمان کی ولادت کے وقت کا ہے۔ بیوی کی دلجوئی کے واسطے حضرت بشیرؓ نے نعمان کو باغ ہبہ کیا۔ بیوی اس ہبہ کی مضبوطی چاہتی تھی۔ اس لیے اس کا یہ بھی اصرار تھا کہ اس پر نبیؐ کو گواہ بنایا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے ایسے ہبہ کو ظلم پر مبنی قرار دیا اور ہبہ کو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت نعمان جب کچھ بڑے ہوئے تو والد کو یہ بات اچھی لگی کہ باغ کی بجائے غلام ہبہ کر دیا جائے، اور ان کی بیوی بھی اس بات پر اس وجہ سے رضامند ہو گئی کہ باغ کی مالیت زیادہ تھی اور غلام کے عطیہ پر تو نبی صلعم کو گواہ بننے پر کوئی اعتراض

نہ ہوگا، اور بعد میں کسی جھگڑے کا احتمال نہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہوئے ہبہ واپس لوٹا دیا۔ لہذا یہ سارا واقعہ بیوی کو راضی کرنے کی خاطر تھا۔ حضرت بشیرؓ صحابی نے اپنے ایک بیٹے سے ترجیحی سلوک کرنے کی دوبار کوشش کی جس کے متعلق حضورؐ کے ارشادات مختلف روائتوں میں بڑے تواتر کے ساتھ ثقاہتاً ملتے ہیں۔

(۱) اتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم (۲) انی لا اُشھد علی جور (۳) فلا اِذن (۴) سوّ بینھم (۵) فلیس یصلح ھذا (۶) انی لا اُشھد الا علی حق (۷) انّ لبنیک علیک من الحق ان تعدل بینھم (۸) فارجعہُ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے نہ صرف یہ کہ ہبہ علی الاولاد کی قباحتوں کے بے شمار پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان دلائل اور وجوہات کی تردید بھی دستیاب ہوتی ہے جو ایسے ہبہ کے جواز میں پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس حضورؐ سے کوئی واقعہ نہیں ملتا جہاں آپؐ نے کسی مقام پر ایسی صورت کو پسند فرمایا ہو یا کم از کم خاموشی اختیار فرمائی ہو۔ بلکہ مزید براں آیت کلالہ کا شان نزول اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے موقعہ پر جہاں ہبہ کی بڑی مناسبت تھی اور نبی صلعم کو اپنے صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ کو اس کا مشورہ دینا چاہیے تھا، وہاں بھی اللہ تعالےٰ کا قانون نازل ہوا۔ (حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوا اور حضورؐ میری عیادت کو تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس مال ہے اور میں کلالہ ہوں یعنی نہ میرے والدین ہیں اور نہ کوئی اولاد بہنیں ہیں اپنا مال بہنوں کو کیونکر تقسیم کردوں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی جس میں بھی قاعدہ للذکر مثل حظ الانثیین کا ارشاد ہوا)۔

۵۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو بعض فقہا نے اخلاقی حیثیت دی ہے، اور اسے مشورہ قرار دے کر اس کے قانونی مقام کو گرایا ہے۔ اور اپنے اس موقف پر جو وجوہات پیدا کی ہیں اور اُن سے جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ اُن پر لاتعداد فقہا نے تعاقب کیا ہے۔ اور ان فقہائے عظام

کے جوابات میں دلائل کے اعتبار سے بڑا وزن ہے۔ کیونکہ وہ بڑی مسکت تردید متن حدیث سے پیش کرتے ہیں۔ اور جب فقہا کی بات کی تردید حدیث رسول اکرمؐ کے الفاظ سے ہو، تو فقہا کی پیروی بھی اسی بات میں ہے کہ حدیث کی پیروی کی جائے۔ ہماری اس بات کی تصدیق ہو گی اگر آپ زرقانی، فتح الباری، اختیارات ابن تیمیہ، دلیل الطالب، مغنی ابن قدامہ، تحفۃ الاحوذی، محلہ ابن حزم، مسک الختام، طحاوی، قسطلانی، اور مسند امام احمد وغیرہ کتب مطالعہ فرمائیں۔ ہم ایک کتاب نیل الاوطار شرح منتقی ابن تیمیہ از شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانی الجزء السادس) سے ترجمہ کر کے درج ذیل کرتے ہیں۔

"اس شخص کا موقف بڑا مضبوط ہے جو عطیہ کے سلسلہ میں اولاد کے درمیان (تسویہ) مساوات کو واجب سمجھتا ہے۔ امام بخاری، طاؤس، ثوری، احمد، اسحاق اور بعض مالکیوں نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے۔ ان لوگوں سے مشہور ہے کہ (انھا باطلۃ) یہ عطیہ باطل ہے۔ کچھ دوسروں نے کہا ہے کہ عطیہ تو صحیح ہے مگر اس کو واپس کرنا واجب ہے۔ اور پھر وہ کہتے ہیں کہ کمی بیشی بھی جائز ہے اگر اس کا کوئی سبب ہو۔ مثلاً ایک بچہ زیادہ محتاج ہو ضمانت یا قرضے کی وجہ سے۔ قاضی ابو یوسف نے تسویہ کو واجب کہا ہے۔ ترجیحی سلوک سے اگر ایک دوسرے کو نقصان دینا مقصود ہو تو پھر بلا شبہ یہ واجب کا مقدمہ ہے۔ اس لیے کہ قطع رحمی اور عقوق (نافرمانی) دونوں حرام ہیں۔ پس جو چیز ان کی طرف لے جائے وہ بھی حرام۔ لہذا جمہور اسی طرف گئے ہیں کہ تسویہ ہی واجب ہے، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر زیادہ دیا بعض کو تو صحیح ہے مگر مکروہ ہے۔ اور انھوں نے اس مسئلہ کو مستحب سمجھا ہے۔ ایسا انھوں نے مسلم شریف کی ایک روایت سے قیاس کیا ہے کہ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ تیری اولاد بھلائی میں برابر ہو۔ اس نے کہا جی ہاں۔ تو آپؐ نے فرمایا پس نہیں جائز اس وقت) اس نہی کو انھوں نے تنزیہی قرار دیا ہے دس وجوہات کی بنا پر جس کا جمہور نے حدیث نعمان کے متن کے الفاظ سے جواب دیا ہے جو کہ درج ذیل ہے:

(۱) موہوب نعمان کے بیٹے اس کے باپ کا سارا مال تھا۔ اس پر بہت لوگوں نے صریح حدیثوں سے تعاقب کیا ہے کہ یہ اس کا بعض مال (تصدق علی ابی ببعض مالہ) صدقہ کیا مجھ پر میرے باپ نے کچھ مال اپنا۔

(۲) عطیہ جو مذکور ہے ابھی عطیہ نہیں تھا۔ صرف مشورہ پوچھا تھا، اور آپؐ نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلعم نے اس کی واپسی کا حکم دیا تھا۔ ارجعہ (فاردده) یہ الفاظ خبر دیتے ہیں کہ موہوب لہ تصدیق ہو چکا تھا، اور عمرہ بنت رواح کے قول سے بھی یہی ثابت ہے کہ میں اس وقت تک راضی نہیں حتیٰ کہ نبی صلعم کو اس پر گواہ کیا جائے۔

(۳) یہ کہ بے شک نعمان بڑا تھا اور اس نے موہوب پر ابھی قبضہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کے باپ کے لیے رجوع کرنا ابھی جائز تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ بھی خلاف ہے کیونکہ اکثر روائتوں میں آچکا ہے (ارجعہ) یعنی اس عطیہ کو واپس کرو۔ یہ لفظ قبضہ ہو جانے کی دلالت کرتا ہے۔

(۴) یہ کہ ہبہ تو جائز ہے مگر باپ کو بیٹے کے ہبہ میں واپسی کا حق ہے۔ اس لیے واپسی کا حکم دیا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ پھر اس کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا۔ اور اتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم کیوں فرمایا۔ جہاں باپ اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھائے۔

(۵) یہ کہ اگر یہ ہبہ ناجائز ہوتا تو آپؐ یہ کیوں فرماتے کہ اس پر کسی کو گواہ کر لو۔ آپؐ امام تھے اور امام کی یہ شان نہیں کہ گواہ بنے۔ امام کی شان تو یہ ہے کہ وہ حکم کرے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ امام کی شان میں یہ بات لازم نہیں ہوتی کہ وہ گواہ نہ بنے۔ حق کی گواہی چھپانا گناہ ہے۔ امام ہو یا غیر امام ہر ایک کے لیے۔ دراصل ان الفاظ سے مراد توبیخ ہے جو کہ سخت ناراضگی کے موقعہ پر بولے جاتے ہیں۔ جیسے قرآن میں آتا ہے۔ من شاء فلیکفر، اور اگر یہ جائز ہوتا تو اس کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا جاتا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک ہے اور ابن حبان بھی بیان

کرتے ہیں کہ حضورؐ کا قول "اشہد" صیغۂ امر ہے، اور اس سے مراد انکار جواز ہے۔ اور ایسے ہی آپؐ کا حضرت عائشہ کے واسطے قول ہے "اشترطی لھم الولاء" ان کے لیے ولا کی شرط لگا دی۔ یہ بات اس امر کی تائید کرتی ہے کہ آپؐ نے اس صورت کو بھی جور کے لفظ سے تعبیر فرمایا تھا۔

(۶) آپؐ کا یہ قول کہ تو ان کے درمیان برابری کر' اس سے امر مستحب اور نہی تنزیہی مراد ہے۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ الفاظ تسلیم ہو سکتے تھے اگر نبی صلعم کے اس امر کے علاوہ اور الفاظ نہ ہوتے۔ بالخصوص "سوّ بینھم" اور "اعدلوا بین اولادکم" ہے اور جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

(۷) اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ محفوظ حدیث نعمان میں "قاربوا بین اولادکم" ہے نہ کہ سوّوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ تم نہیں واجب سمجھتے ہو مقاربت کو جیسا کہ نہیں واجب سمجھتے ہو تشبیہ کو۔

(۸) واقعہ کی جو تشبیہ ہے وہ یہ ہے کہ اولاد کے درمیان برابری کے ذریعہ نیکی کرتے ہیں اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ امر مستحب تھا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ عدم مساوات پہ جور کا لفظ بولنا اور ترجیح یا فضیلت کی نہی کرنا یہ دونوں وجوب کی دلالت کرتے ہیں۔ پس ان دونوں قرائن کو اپنے اصل سے پھیرنا جائز نہیں (یعنی اوامر میں اصل وجوب ہے اور نہی میں اصل حرمت۔ یہ دونوں اپنے مقام پر رہیں گے۔ جب تک کوئی قرینہ ان کو اپنے اصل مقام سے ہٹا کر امر استحباب میں اور نہی کو تنزیہی میں نہ لے آئے) اور وہ یہاں موجود نہیں۔

(۹) ابوبکرؓ نے عائشہؓ کو اور عمرؓ نے عاصمؓ کو عطیہ دیا۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ جواب: یہاں پر یہ کہاں ہے کہ اُن کے باقی ورثا نے اُن کے اس فعل پر اظہارِ ناراضگی کیا۔ پھر یہ فعل خلفاء کا صحیح حدیث کے مقابل کیسے تسلیم ہوگا۔ (بقاعدہ اصول)

(۱۰) یہ کہ اجماع ہو چکا ہے کہ ایسا عطیہ جو آدمی غیر اولاد کو دے وہ جائز ہے۔ خواہ وہ اپنا تمام مال کسی کے حوالے کر دے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی کچھ اولاد کو چھوڑ کر کچھ کو اپنے مال کا مالک

بنا دے تو یہ بھی جائز ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ نص کے مقابلہ میں قیاس کا ضعف مخفی نہیں۔

اِنّ لبنیك علیك من الحق ان تعدل بینھم۔

پس حق بات یہ ہے کہ تسویہ واجب ہے اور کمی بیشی حرام ہے۔

طحاوی میں حضرت امام ابوجعفر نے بھی اولاد کے درمیان عدم تسویہ کی صورت میں ہبہ کو باطل قرار دیا ہے۔

۶۔ لہٰذا جن بزرگوں نے حدیث مندرجہ بالا کو مشورہ کا مقام دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے مشوروں کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد تو قرآن کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے:

ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کله	اللہ پاک وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔

کیا مشوروں سے دین غالب ہو سکتا ہے؟ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدیث پاک میں مشورہ کا وقوع بھی دو دفعہ ملتا ہے۔ ایک تو بریرہ لونڈی کے نکاح کے موقعہ پر حضورؐ نے اس کو مشورہ دیا تھا جس کی بریرہؓ نے اسی وقت حضورؐ سے وضاحت کروالی۔ اور پیروی سے آزاد ہو گئی۔ نبی صلعم کا مشورہ اس نے قبول نہ کیا۔ دوسرے کھجور کے درخت کو پیوند لگاتے وقت لوگوں نے حضورؐ کی بات کو حکم تصور کر لیا۔ حالانکہ وہ ایک مشورہ تھا۔ اور اس کو قبول کرنے کا انجام خسارے کی صورت میں رونما ہوا، جس پر نبی صلعم نے "تاسف کا اظہار فرمایا۔ ہر دو واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ میں تو آدمی آزاد ہوتا ہے۔ اس میں اتباع کی صورت رونما نہیں ہوتی۔ اور اس نقطۂ نظر سے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بشیرؓ کا ہبہ بار بار واپس لوٹایا جا رہا ہے، اور صحابی رسول اللہ اس کی ایک امر کے طور پر اتباع کر رہا ہے۔ اور پھر حدیث پاک کے مختلف الفاظ اور جملے اس

کی قانونی حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً عدل کا لفظ قانون سے تعلق نہیں رکھتا؟ شہادت اور ہبہ کا مسئلہ قانونی مسئلہ نہیں؟ ناجائز اور ناحق قانونی الفاظ نہیں؟ اور پھر یہ بات کہ کسی حدیث کو قانون یا اخلاق کی تمیز کرنے میں کونسا پیمانہ ہے جو ان دونوں کا فرق کر کے بتائے کہ اس کا تعلق اخلاق سے ہے یا قانون سے؟ لہذا اگر یہ حدیث قانونی حیثیت نہیں رکھتی تو پورا ذخیرہ حدیث اور کچھ حصہ قرآن بھی قانونی حیثیت سے خارج ہو کر رہ جاتا ہے۔

جو لوگ اس حدیث کو مشورہ کا مقام دیتے ہیں وہ نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ ایسا کرنا عنداللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے۔ یہ اصطلاح دراصل گناہ کو جائز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ حالانکہ قرآن گناہ کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور نہ صرف گناہ بلکہ دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو بھی حرام قرار دیتا ہے

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق۔ (اعراف)

اے محمدؐ! اُن سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں۔ بے شرمی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی۔

اس آیت پاک میں گناہ کو صاف طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں پر بعض فقہاء کا مندرجہ بالا موقف نہ صرف گناہ کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اللہ کے مقرر کردہ ورثا کے حقوق پر ہبہ علی الاولاد کے ذریعہ دست درازی کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اس موقف کے قائل حضرات خواہ اس کی کس قدر وکالت کریں ان کی صورت لارڈ میکالے کی مرتب کردہ تعزیرات پاکستان سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ کہ اس تعزیرات کی رو سے ایک شادی شدہ عورت اغوا ہو جائے یا بداخلاقی کا ارتکاب کرے، اور اغوا کنندہ پر عدالت میں مقدمہ چلے، استغاثہ اگر یہ ثابت کر دے کہ ارتکاب کنندہ کو معلوم تھا کہ عورت شادی شدہ ہے اور معلوم ہونے کے باوجود اس نے سب کچھ کیا تو وہ قانون کی زد میں آجائے گا۔ لیکن اگر استغاثہ یہ ثابت نہ کر سکے اور ملزم یہ ثابت

کر دے کہ اُسے عورت کے منکوحہ ہونے کا کوئی علم نہ تھا تو قانون اسے بری کر دے گا۔ گویا سمجھا جائے گا کہ یہ گناہ تو ہے مگر قانوناً مرد و زن کا یہ فعل جائز ہے۔ مروّجہ تعزیرات میں ایسے ہی اسقام ہیں جن کی وجہ سے ہماری قوم میں اخلاقی انحطاط اور جنسی بے راہ روی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اغوا کی وارداتیں، کلب کے رقص اور فحاشی و بے حیائی کے طوفان اُمڈ رہے ہیں۔ انھی خامیوں کو ہدف بنا کر تعزیرات پاکستان پر تنقید کی جاتی ہے، اور اس کی جگہ نفاذ کے لیے اسلامی قانون کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسلامی قانون میں بھی اسی قسم کے رخنے پیدا کر لیے گئے، اور چور دروازے یا حیلہ سازیوں کی راہ کھول دی گئی تو یہ اسلامی قانون کی خدمت نہ ہو گی بلکہ یہ صورت اُلٹا اس کی بدنامی اور زوال کا سبب بنے گی۔ اور پروان چڑھنے سے پہلے ہی اسے ختم کر کے رکھ دے گی۔ ایک مثال یاد آ گئی کہ سال گزرنے کو تھا کہ مال بیوی کے نام کر دیا گیا۔ اور دوسرا سال ابھی پورا ہونے نہیں پایا تھا کہ مال میاں نے لے لیا۔ تاکہ نہ سال پورا ہو اور نہ زکوٰۃ دینا پڑے۔ غالباً ایسا کرنا بھی عند اللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا قانون موم کی ناک ہے کہ جس طرف چاہا موڑ لیا؟ قانون لوگوں کے سامنے بے بس ہے یا لوگ قانون کے سامنے بے بس؟ اِن حیلہ سازیوں کا علاج قانون نہیں کر سکتا؟ کیا قانون کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور یہ شل ہے؟ اگر یہی صورت ہوتی تو حضرت ابابکر صدیقؓ مانعین زکوٰۃ پر کیسے چڑھائی کر سکتے تھے اور وہ کیا دلیل تھی جس نے حضرت عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہؓ کو اس معاملہ میں خاموش کر دیا تھا۔ لہذا موشگافیوں کے چکر میں پڑنا درست نہیں۔ ہم نے یہ مثالیں اس لیے پیش کی ہیں کہ اندازہ ہو سکے اور سمجھا جا سکے کہ حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ کی حدیث کو جن بزرگوں نے مشورہ کا مقام دیا ہے یہ ان کا سہو ہے اور یہ چیز قابلِ تقلید نہیں بلکہ قابلِ اصلاح ہے۔ اور اس کے برعکس جن حضرات نے اس حدیث کو قانون کا مقام دے کر ایسے ہبہ کو باطل قرار دیا ہے اور عدالت کو ایسے ہبہ کے توڑنے کا حق دیا ہے وہ بالکل درست اور

منشائے شریعت کے عین مطابق ہے۔

۷۔ یہاں تک بحث حدیث کی اُس صورت کے متعلق تھی جو حضورؐ کو اپنے ایک صحابیؓ کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ اور اس کا تعلق صرف بیوی کو خوش کرنے کی حد تک تھا لیکن آج کل جو صورت رونما ہو رہی ہے وہ اس قدر سنگین ہے کہ معاشرہ اسلامی قانون کی وفاداری کے بجائے ہندو رواج کو پسند کر رہا ہے اور لوگ نہیں چاہتے کہ لڑکیاں ان کی جائیداد کی وارث ہوں۔ فقہار کا یہ اصول (کہ ہبہ علی الاولاد بصورت عدم تسویہ عنداللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے) ہمارے لوگوں کے ہاتھ ایک حربہ کا کام دیتا ہے جس کو اپنی مقصد برآری کے لیے وہ خوب استعمال کرتے ہیں۔ ایسی صورت کو بھلا اسلام کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ حضورؐ کے سامنے اگر یہ صورت رونما ہوتی تو آپؐ ایسے شرک میں ملوث معاملہ کا بڑا سخت نوٹس لیتے۔ جب کہ معمولی صورت پر حضورؐ کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ قرآن غیر اللہ کے قانون کی اطاعت و وفاداری کو شرک قرار دیتا ہے اس لیے میرا یہ دعوےٰ ہے کہ وہ فقہار جنھوں نے ہبہ علی الاولاد بصورت عدم تسویہ کو جائز کہا ہے اگر ان کے سامنے یہ صورت رونما ہوتی تو وہ بھی لازماً اسے حرام قرار دیتے۔ آج ہمارے معاشرہ کے بعض سرکردہ افراد اعلانیہ کہتے ہیں کہ "اسلام کے یہ قوانین جن سے لڑکیاں بھی وراثت میں شریک ہو جائیں ہمیں پڑتا نہیں کھاتے۔ کیونکہ ہم اپنے آباو اجداد کے رسم و رواج اور طور طریقوں کو پسند کرتے ہیں۔ اور لڑکی کی شادی کے وقت جہیز بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو ناک کٹتی ہے اور شادی پر اس قدر خرچ کر چکنے کے بعد ہمارے لیے لڑکی کو جائیداد بھی بانٹ دینا ناقابلِ برداشت ہے۔"

دراصل ہبہ علی الاولاد بصورت عدم تسویہ کے جواز کی راہ ان لوگوں میں یہ جسارت پیدا کر رہی ہے کہ وہ ایسے استدلال کو بڑی جرأت کے ساتھ اختیار کرتے ہیں جو سراسر کفر پر مبنی ہے وُجدنا علیہ آباءَنا' ازل سے اسلام کے خلاف کفر کا نعرہ رہا ہے۔ کفار اگر یہ باتیں کریں تو قرین قیاس ہیں، لیکن مسلمان کے لیے اپنے دین کے بالمقابل آبا و اجداد کی رسومات کی پیروی

کرنا کسی بھی فقہی مذہب میں نا قابل برداشت ہے اور پھر اسلامی قانون کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا، اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر غیر اسلامی قوانین کو پسند کرنا دراصل نفاق کی نشانی ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو ایسے مسلمان کا سر قلم کر دیا تھا۔ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی مسلک اسے جائز قرار دے۔

قرآن مجید نے یہود اور نصاریٰ کو یہ طعنہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو خدا کے سوا رب بنا لیا ہے۔ یعنی یہودی اور عیسائی علما لوگوں کو خدا کی راہ سے ہٹا کر جو دینی موشگافیوں کے پھندوں میں پھنسایا کرتے تھے وہ قرآن کے نزدیک دوسرا رب بنانے کے مترادف ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات کے باوجود اگر ہم اپنے فقہاء کی تقلید میں وہی کچھ کرتے چلے جائیں جو یہود و نصاریٰ کیا کرتے تھے تو کیا یہ بھی ویسی ہی حرکت نہ ہوگی جس پر قرآن طعنہ دیتا ہے۔ حالانکہ ہمارے فقہائے عظام بار بار اپنی کتابوں میں لکھ چکے ہیں کہ حدیث پاک کے مقابلہ میں ہماری بات کو دیوار پر دے مارو۔ لہٰذا اس معاملہ میں اُن پر کوئی گرفت نہیں۔ اس امر کے مجرم عنداللہ تو ہم لوگ ہوں گے جو عبرت نہیں پکڑتے۔

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاد میں سے بعض کے حق میں باستثنائے دیگر ہبہ کرنا سراسر قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ اور نہ صرف گناہ ہے بلکہ قطعی طور پر حرام ہے۔ اور ہمارے مروّجہ قانون کی نظر ثانی ہونی چاہیے۔ علمائے اسلام کو اس کے خلاف آوازِ حق بلند کرنی چاہیے تاکہ ہماری عدالتیں اس پہلو پر غور و خوض کر کے قانون ہبہ درباره بعض اولاد باستثنائے دیگراں کی صحت کر سکیں۔